جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ

عظیم شخصیات

آسمان سے نہیں اترتیں

بلکہ

زمین پر پیدا ہوتی ہیں،

زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛

اور یہ کہ

ہر بچہ

اگر 'چاہے'

تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

پیام محسنِ انسانیتؐ کو عام ہونے دو
ابھی کافور ہو جائے گا نفرت کا دھواں سارا

”ہم مسلمانوں سے کڑوی بات کہتے ہیں، ہم ان سے کہتے ہیں، تم نے ان باتوں کو مانا ہے، تمھارا ان باتوں پر ایمان ہے، تم ان اخلاق و کردار کو چھوڑ کر جانوروں کی سطح پر آ گئے، تم اپنے کردار اور عمل سے اسلام کو بدنام کرتے ہو، اس کے روشن نام کو بٹہ لگاتے ہو، تم دنیا کو اسلامی زندگی کی جو چلتی پھرتی فلم دکھلا رہے ہو وہ بڑی افسوسناک ہے۔ تم نے جو زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے، اس میں کونسی جاذبیت ہے؟ پہلے تم جس راہ سے گزر جاتے تھے، نقش چھوڑ جاتے تھے، دیر تک تمھاری خوشبو محسوس ہوتی رہتی تھی، جیسے نسیم کی خوشگواری محسوس ہوتی رہتی ہے۔ مسلمان جدھر سے گزر گئے گلی کوچے معطر کر گئے، اور جہاں سے چلے آئے وہاں سے سفارتیں بھیجی گئیں کہ ہمارے ملک میں سب کچھ ہے، مسلمان نہیں ہیں، جنہیں دیکھ کر لوگ اپنی زندگی درست کریں اور جو ان کے مقدمات و معاملات میں بے لاگ فیصلہ کریں۔ ان کی خواہش پر مسلمان بھیجے گئے۔ افسوس اب تم ایسے بن گئے ہو کہ تمھارے نہ ہونے سے ملک میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، آج تک کسی نے اپنے ملک سے ماہرین فن، ڈاکٹروں اور دستکاروں کو نکالا ہے؟ مشرقی پنجاب میں لوہاروں کی ضرورت تھی تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بسائے گئے۔ اگر تم میں اخلاقی برتری ہوتی تو اخلاقی ضرورت کا احساس مجبور کرتا کہ تمھیں ملک کی امانت سمجھ کر رکھا جائے۔ تمھارے دودھ والے پانی ملانے سے پرہیز کرتے، تمھارے درزی کپڑا بچانے کو عیب سمجھتے، تمھارے دستکار اور مزدور محنت سے پورا دن لگ کر کام کرتے، تمھارے حاکم رشوت کو حرام سمجھتے تو دنیا کا کوئی ملک تمھاری جدائی گوارا نہ کرتا۔[۳۷]“

(ابوالحسن علی ندوی)

ابوالحسن علی ندوی

پیدائش، بچپن اور تعلیمی زندگی: سید ابوالحسن علی 5 دسمبر 1913 کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے عبداللہ اشتر سے لے کر سید احمد شہیدؒ تک ہندوستان کی سرزمین پر دین حق کے لیے مر مٹنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ ان کے والد ایک کثیر التصانیف مصنف اور علم دوست انسان تھے۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ 1923 میں والد کے انتقال کے بعد والدہ اور بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی نے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ بھائی سے استفادہ کرنے کے بعد عربی کی باقاعدہ تعلیم انھوں نے یمنی النسل استاد خلیل بن محمد عرب سے حاصل کی جو لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ اس دوران وہ نجی طور پر انگریزی پڑھتے رہے۔ 1927 میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فاضل ادب عربی کے درجے میں داخل ہوئے مگر افسوس کہ نحو کے مضمون میں کمزور ہونے کی وجہ سے (دیگر مضامین میں فرسٹ کلاس کے باوجود) وہ سالانہ امتحان پاس نہ کر سکے لیکن نوجوان علی نے ہمت نہ ہاری اور عزم و استقلال کے ساتھ سال بھر محنت کی اور اپریل 1929 کے سالانہ امتحان میں نہ صرف فرسٹ کلاس کامیاب ہوئے بلکہ گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔

جون 1929 میں پھوپھی کے اصرار پر لاہور گئے، دیگر اہل علم حضرات کے علاوہ علامہ اقبال سے بھی ملاقات کی۔ انھوں نے علامہ اقبال کی نظم 'چاند' کا منظوم عربی ترجمہ کر کے انھیں سنایا تو علامہ ایک پندرہ سالہ لڑکے کی عربیت سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد علی میاں نے مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی اور مولانا شبلی جیراجپوری سے دو سال تک حدیث و فقہ پڑھی۔ مولانا کی ذہانت کے پیش نظر بعض اعزہ کا مشورہ تھا کہ وہ انڈین سول سروسز کا امتحان دیں لیکن ان کی والدہ ماجدہ کو اس کی بھنک لگی تو انھوں نے خط لکھ کر ابوالحسن کو اس سے باز رہنے کی ہدایت کی کہ ان کی منزل کچھ اور ہے۔ امت اس خاتونِ عظیم کی احسانمند ہے۔

1930-31 میں علی میاں، مولانا احمد علی لاہوری سے استفادے کے لیے لاہور گئے، قرآن کی کچھ سورتوں کے علاوہ حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیا۔ 1932 میں مولانا حسین احمد مدنی سے حدیث پڑھنے کے لیے دیوبند گئے اور صحیح بخاری و ترمذی پڑھی۔ بچپن سے ہی مطالعے کا چسکہ اور اپنے کتب خانے میں اضافے کا شوق تھا۔ علاوہ ازیں آپ ایک ذہین طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ہاکی، شکار اور تیراکی کا شوق بھی رکھتے تھے۔ الغرض ایک مدت تک بحر علم کی غواصی کے بعد مولانا نے عملی دنیا میں قدم رکھا اور علم و عمل، تحریک و تصوف کے بیش بہا موتی بکھیر کر ایک عالم کی نگاہوں کو خیرہ کیا۔

سراپا تدریس، سراپا دعوت: 1934 میں مولانا ندوہ میں عربی ادب اور تفسیر و حدیث کے استاد ہو گئے۔ منطق و تاریخ اسلامی کے دروس بھی انہی کے پاس تھے۔ جوش دعوت کا یہ عالم تھا کہ 1935 میں خصوصاً بمبئی کا سفر اختیار کر کے ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دی۔ فکر اقبال سے خاصے متاثر تھے، 1937 میں علامہ سے ایک تفصیلی ملاقات بھی کی۔ اسی زمانے میں ترجمان القرآن کے ذریعے مولانا مودودیؒ سے قلبی تعلق استوار ہوا، 1940 کے لگ بھگ انھوں نے مولانا مودودی کو ندوہ آنے کی دعوت دی جہاں مولانا مودودی نے اسلامی نظام تعلیم پر ایک لیکچر بھی دیا۔ علی میاں جماعت اسلامی کے ابتدا ہی سے رکن رہے۔ 1941-43 تک مقامی جماعت کے امیر بھی رہے۔ لیکن بعد میں جماعت میں 'سیاست کی مرکزیت' اور 'روحانیت کے فقدان' جیسی چند غلط فہمیوں کی بنا پر یہ تعلق زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ انہی دنوں وہ مولانا الیاس کی دینی دعوت سے متاثر ہوئے، ان کے روحانی اور تصوفانہ مزاج سے یہ دعوت زیادہ مطابقت بھی رکھتی تھی۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر ان کی تنقید علمی اور نظریاتی تھی، سطحی لوگوں کی طرح انھوں نے مولانا مودودی کی ذات گرامی پر کیچڑ اچھالنے جیسی شنیع حرکات سے پرہیز کیا اور اپنی توانائی تعمیری کاموں میں خرچ کرتے رہے۔

1943 میں انجمن تعلیمات دین کا قیام کیا اور اس پلیٹ فارم سے آسان زبان میں خطبات کے ذریعے دین کی بنیادوں کو عوام خصوصاً نوکر شاہی سے متعلق مسلمانوں میں راسخ کرتے رہے۔ 1947 اور 1950 میں حج کیا۔ جنوری 1951 میں عالم عرب کا سفر اختیار کیا۔ مصر، سوڈان، دمشق، اردن، فلسطین وغیرہ ممالک کی سیر کی۔ 1950 میں چھپ کر آئی ان کی کتاب انسانی دنیا پر

مسلمانوں کے عروج وزوال کے اثرات عالم عرب میں ان کے تعارف کا ذریعہ بنی؛ ہر جگہ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، بڑی ادبی اور دینی شخصیات سے ملاقاتیں رہیں۔ ریڈیو پر، اخوان المسلمون، شبان المسلمین اور قاہرہ یونیورسٹی وغیرہ کے جلسوں میں آپ کی تقاریر کی خوب پذیرائی ہوئی۔ یہیں سے علی میاں ترکی بھی ہو آئے۔

اس سفر سے واپسی پر سید سلیمان ندوی کی تجویز پر انھیں ندوۃ العلماء کا نائب معتمد تعلیم بنایا گیا، 1953 میں سید سلیمان کی وفات پر آپ معتمد تعلیم مقرر کیے گئے۔ 1961 میں ڈاکٹر عبدالعلی کے انتقال کے بعد علی میاں کو ندوہ کی نظامت کے فرائض سونپ دیے گئے۔

تصانیف: اپنی حد درجہ مصروف زندگی اور کثرت اسفار کے باوجود آپ نے ایک گراں قدر تصنیفی ذخیرہ چھوڑا ہے۔ عرب اہل زبان بھی ان کی عربی کے قائل تھے۔ کثرت مطالعہ اور ادبی ذوق کی وجہ سے ان کی تحریروں میں کبھی مولویانہ خشکی پیدا نہ ہو پائی۔ ابھی 16 سال ہی کے تھے کہ سید احمد شہیدؒ پر ایک وقیع مضمون کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا۔ استاد تقی الدین ہلالی نے اسے پسند کیا اور علامہ رشید رضا کے پاس مصر بھیجا۔ یہ مقالہ پہلے عالمی شہرت یافتہ المنار کے صفحات کی زینت بنا پھر علاحدہ ایک رسالے کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد تو علی میاں کے رخش قلم نے ان کی سانسوں سے پہلے تھمنے کا نام نہیں لیا۔ اردو میں ان کی کتب تاریخ دعوت وعزیمت (پانچ جلدیں)، سیرت احمد شہیدؒ (دو جلدیں)، المرتضی، نقوش اقبال، نبی رحمت، ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں، اور کاروان زندگی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے بیشتر خطبات ومقالات کو بھی یکجا کر کے کتابی شکل دی جا چکی ہے۔ انھوں نے **البعث الاسلامی**، **الرائد** اور **ندائے ملت** جیسے کئی رسائل وجرائد کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔ روائع اقبال کے ذریعے عرب دنیا کو اقبال کے افکار سے روشناس کرایا۔ نوعمروں میں عربی کے صحیح ذوق کو پروان چڑھانے کے لیے آسان مگر معیاری عربی میں انھوں نے **مختارات** اور **قصص النبیین** لکھ کر عربی نصاب میں ایک بڑے خلا کو پر کیا ہے۔ دعوت دین اور درد ملت، یہ ان کی ہر تحریر کا موضوع اور ہر تقریر کا گداز ہوا کرتا تھا۔ چودہ سال تک انتہائی ضعف بصارت اور ایک آنکھ کے زیاں کے باوجود ان کے تصنیفی مشاغل میں کوئی خلل واقع نہ ہوا۔

ملی سرگرمیاں: 1954 میں انھوں نے **تحریک پیام انسانیت** کے ذریعے ہندو

مسلمانوں کی آپسی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے کے خطبات ورسائل انسانی بنیادوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب لانے میں سازگار ثابت ہوئے۔ 1959 میں بڑے پیمانے پر معیاری اسلامی کتب کی اشاعت کے لیے انھوں نے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی بنا ڈالی۔ 1961 میں ندوہ کی نظامت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی وہ انقلابی تبدیلیوں کا باعث بنے۔ نصاب میں اصلاحات ہوئیں۔ قرآنی علوم، عربی زبان وادب، دعوت اسلام واعلام (میڈیا) جیسے شعبے کھولے گئے۔ تحقیقی مقالوں پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا آغاز ہوا۔ الغرض علی میاں نے ندوہ کو ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی بنانے کے لیے دن رات ایک کردیے۔

علی میاں 1962 میں مکہ مکرمہ میں تشکیل شدہ رابطہ عالم اسلامی کے رکن اساسی تھے، وہ اس کی متعدد ذیلی تنظیموں اور کمیٹیوں کے بھی نمایاں رکن رہے، اس ضمن میں بیرون ممالک دوروں اور میٹنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ باوجود معذوریوں کے آخر تک جاری رہا۔ اسی سال مدینے میں جامعہ اسلامیہ کا قیام ہوااور اس کے بھی آپ رکن اساسی رہے۔ آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹریز OIC کے متعدد جلسوں میں آپ شریک رہے۔ 1984 میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیااور آپ نے اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے بارہا مولانا ندوی کی 'مسیحائی قیادت' کے کرشمے دیکھے۔ مسلم مجلس مشاورت، دینی تعلیمی کونسل، مسلم پرسنل لاء بورڈ، اور ایسے دیگر اداروں کے قیام و بقا میں ان کا اہم رول رہا۔ 1966 میں مصر میں اخوان پر مظالم کے خلاف جمال عبدالناصر کی استبدادی حکومت پر تنقید کرنے کے 'جرم' میں حکومت ہند نے ان کا پاسپورٹ اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ 1976 میں وہ آپ ہی تھے جنہوں نے (ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد) وزیراعظم اندراگاندھی سے ملاقات کرکے نس بندی کے سلسلے میں اسلامی موقف کا جرأت وبیباکی سے اظہار کیا۔ 1986 میں شاہ بانو کیس کے مسئلے سے سلگی یکساں سول کوڈ کی چنگاری کے خلاف انھوں نے کڑا رخ اختیار کیا۔

بابری مسجد کے معاملے میں بھی مولانا ندوی کی مجاہدانہ طبیعت نے کسی سمجھوتے سے انکار کردیا۔ جب کلیان سنگھ کی حکومت نے سرکاری اسکولوں میں وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کو لازمی قرار دیااور اس پر مصر رہی تو مولانا نے سرکاری اسکولوں سے مسلم بچوں کو نکال لینے کی دھمکی دی۔ اس سخت رویے سے

بوکھلائی حکومت نے ان احکامات کو منسوخ کر دیا اور وزیر تعلیم بدل ڈالے گئے۔ ان تمام نا مساعد حالات میں مسلمانوں کو متحد کر کے شر سے خیر برآمد کر لینے کا ہنر انھیں آتا تھا۔ وہ ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان تھے شاید اسی لیے اندرا گاندھی ہوں یا راجیو گاندھی؛ دیو گوڑا ہوں یا اٹل بہاری واجپئی... اپنی مسلم نوازی کا ثبوت دینے کے لیے، عیادت یا 'مشورے' کے بہانے مولانا کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری خیال کرتے تھے۔

1980 میں ان کی اسلامی خدمات کے اعتراف میں انھیں کشمیر یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے بھی نوازا، اسی سال شاہ فیصل ایوارڈ بھی آپ کو ملا۔ 1982 سے تا حیات وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر رہے۔ سیرت النبی کی ساتویں جلد کا مقدمہ لکھنے پر پاکستانی حکومت کی جانب سے ایک لاکھ روپے ملے، حکومت برونائی نے ایک قیمتی ایوارڈ سے نوازا۔ 1998 میں دبئی حکومت کی جانب سے عالم اسلام کی ممتاز شخصیت کا ایوارڈ ملا۔ ان تمام اعزازات سے ملی خطیر رقومات کو انھوں نے لوجہ اللہ صرف فرمایا۔

چھیاسی سال کی عمر میں 31 دسمبر 1999 کو (جب اس صدی اور اس ہزارے کا سورج غروب ہونے والا تھا)، اس مرد آہن، مرد درویش، عالم باعمل، بے نظیر انشا پرداز اور متحرک وفعال قائد نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کے عوض اجر جزیل سے نوازے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین!